محقق دوانی ہندوستان میں

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی
سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

اسلام کی فکری تاریخ میں عموماً اور ہندوستان کی علمی تاریخ میں خصوصاً محقق دوانی کی شخصیت مخصوص اہمیت کی حامل ہے۔ فلسفیانہ تفکیر کا جو سلسلہ شیخ بو علی سینا (بلکہ افلاطون و ارسطو) کے زمانہ سے چلا آرہا ہے، اور جس کے فیض سے اس گئے گزرے زمانہ میں بھی ہمارے عربی مدارس کے اندر حکمت و معقولات کا چرچا سنائی دیتا ہے، اس کے واسطۃ العقد محقق دوانی ہی تھے، پھر مغلوں کی آمد کے بعد دسویں صدی ہجری کے وسط سے ہندوستان میں جو علمی و تعلیمی انقلاب آیا اور جس کے نتیجے میں یہاں نصاب پر معقولات ہی معقولات چھا کر رہ گئیں، وہ محقق دوانی ہی کے تلامذہ کے نفسِ گرم کی تاثیر تھا۔

محقق دوانی کے حلقۂ درس سے سینکڑوں با کمال فارغ ہو کر نکلے اور اقطاعِ عالم میں جا جا کر علم و فضل کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، ان میں سے ایک کثیر تعداد ہندوستان کو آئی، جن میں سے پانچ بزرگ خاص طور سے مشہور ہیں، یہ کہنا کہ آج ہمارے یہاں فلسفہ و معقولات کا جو ذوق نظر آتا ہے، انھیں کے فیضِ تلمذ کا نتیجہ ہے۔

لیکن کیا خود محقق دوانی بھی ہندوستان میں تشریف لائے ہیں؟ جہاں تک تاریخی تحقیق کا تعلق ہے اس کا جواب نفی میں ہے [illegible] البتہ بعض اہل علم ہیں جو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں آئے تھے اور ابو القاسم

کو تو بآسانی نظرانداز کیا جاسکتا ہے اور ان کے اس قول کو اُن کے تسامح پر محمول کرسکتے ہیں مگر تعجب ہے
مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے ایک مستقل فصل اپنی کتاب میں

"علامہ دوانی ہندوستان میں"

کے عنوان سے قائم کی ہے لیکن ایسا اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ تسامح کوتاہی مطالعہ و قلت تدبر سے زیادہ اُن کی تعجیل نگاری کا نتیجہ ہے۔ اس باب میں انھوں نے مولانا عبدالحیٰ ندوی کی "نزہۃ الخواطر" کو اپنا ماخذ بنایا ہے، حالانکہ انھیں یہ معلوم تھا کہ اس باب میں "نزہۃ الخواطر" کا ماخذ برنی ہے۔

برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کوئی نادر و نایاب کتاب نہیں ہے، دہلی آٹھویں صدی ہجری کے مسلم ہندوستان کی سیاسی و ثقافتی تاریخ کا محقق اس سے صرف نظر کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں "اخبار الاخیار" سے بھی بے نیازی روا نہیں رکھی جاسکتی، کمتر معروف آخذ و مصادر میں مطہر کا دیوان بھی ہے۔ جس میں واقعۂ زیر بحث کی تحقیق کے لئے کافی مواد مل سکتا تھا (تفصیل آگے آرہی ہے) شاید اور کتابوں میں بھی زیر بحث واقعے کے حوالے ہوں گے۔ مگر مولانا نے جس وجہ سے بھی ہو ان میں سے کسی کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ پھر اگر مولانا ذرا سا غور و تدبر بھی فرماتے تو شاید اس عنوان اور بیان کے تحریر کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ مولانا نے لکھا ہے :-

"علامہ قطب الدین رازی کے تلمیذِ رشید مولانا جلال الدین دوانی ہندوستان تشریف لائے۔"

علامہ قطب الدین رازی کا سالِ وفات سنہ ۷۶۶ھ ہے اور محقق دوانی کا سنہ ۹۰۸ھ گویا مرحوم استاد و شاگرد کے سنینِ وفات کے درمیان ۱۴۵ سال کا فرق ہے۔ پھر برنی نے فیروز شاہ کے عہد کے صرف پہلے چھ سال کا ذکر کیا ہے۔ انھیں چھ سال میں اُس نے وہ مشہور مدرسہ بنوایا تھا جس کے بارے میں مولانا گیلانی نے لکھا ہے۔

"عمارت جب تیار ہوگئی تو اس دانش پژوہ معارف پرور بادشاہ نے اس کا مصرف یہ کیا کہ علامہ قطب الدین رازی کے تلمیذِ رشید مولانا جلال الدین دوانی جب ہندوستان تشریف لائے تو آپ کو اسی عمارت میں ٹھہرایا گیا اور مولانا نے اس عمارت کو اپنا مدرسہ بنا لیا۔"

فیروز تغلق سنہ ۷۵۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اس لئے مولانا جلال الدین جنھیں مولانا گیلانی نے محقق دوانی لکھا ہے سنہ ۷۵۸ھ سے قبل ہی تشریف لائے ہوں گے، اور چونکہ فیروز نے انھیں اس مدرسہ کی صدارت تفویض

کا تھی جو عموماً پختہ سالی میں سپرد کی جاتی ہے، اس لئے اگر اس موقع پر مولانا جلال الدین کی عمر چالیس سال بھی فرض کی جائے تو اس طرح اُن کا سال ولادت ۷۱۸ھ سے قبل قرار پاتا ہے لہٰذا بوقت وفات ان کی عمر ۱۹۰ سال سے زیادہ ہونا چاہیے، جو عام حالات میں مستبعد ہے اور اگر ہوتی ہے تو اس غیر معمولی درازیٔ عمر کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہاں مولانا گیلانی ؒ نے بڑی عجلت سے کام لیا ہے، قطب الدین رازی کے جو شاگرد ہندوستان تشریف لائے اور جنھیں فیروز تغلق نے مدرسہ فیروزی کی صدارت تفویض کی وہ "مولانا جلال الدین رومی" تھے، (جو مولانا روم کے علاوہ ایک اور بزرگ تھے) اور محقق دوانی کا اسم گرامی "مولانا جلال الدین محمد دوانی" (ولد مولانا سعد الدین اسعد صدیقی) تھا۔ مگر چونکہ اول الذکر ایک "امام معقولات" کے شاگرد تھے اور ثانی الذکر خود امام معقولات۔ لہٰذا مولانا کی تعجیل فرمائی نے دونوں کو ایک ہی شخصیت سمجھ لیا حالانکہ دونوں کے درمیان تقریباً پون صدی کا فصل ہے۔

لیکن اس تسامح کی تحقیق سے پیشتر انسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں مولانا گیلانی ؒ نے جو کچھ لکھا ہے اُسے بلا کم و کاست نقل کر دیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"لوگوں کو معلوم نہیں ہے ورنہ جب کتابوں میں یہ لکھا ہوا تھا کہ منطق و فلسفہ کے مشہور امام علامہ قطب الدین الرازی التحتانی کے براہ راست شاگرد بھی ہندوستان پہونچ کر فنون عقلیہ کی تعلیم دے رہے تھے تو اُسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ان علوم کے متعلق کون کونسی کتابیں نہ پڑھائی جاتی ہوں گی"

ایک معقولی عالم کے لئے شاہانہ اہتمام

میرا مطلب یہ ہے کہ فیروز تغلق نے علاء الدین خلجی کے بنائے ہوئے تالاب کے بند پر جو ایک خوبصورت عمارت تیار کی تھی جس کے متعلق برنی کے حوالے سے صاحب نزہۃ نے نقل کیا ہے:

كانت سقوفها طويلة العماد متسع الساحة كثيرة	اس کی عمارت لمبے لمبے اونچے ستونوں پر قائم تھی اور ایک
القباب والصور لم يعهد مثلها قبلها ولا	وسیع میدان میں تھی، عمارت پر بکثرت قبے بنے ہوئے تھے نیز
بعدها (نزہۃ الخواطر ص ۲۲)	بکثرت تصویریں بنی تھیں۔ ایسی عمارت نہ کبھی اس سے پہلے بنی نہ بعد۔

بدائی نے تو یہاں تک اس عمارت کے متعلق مبالغہ کیا ہے کہ :-

انہا من عجائب الدنیا فی ضخامتہا — اپنی جسامت اور عظمت نیز دسعت کے لحاظ سے یا کیزہ آب و ہوا کے

وسعۃ صحنہا وطیب ماءہا وھواءہا — لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہونا چاہئیے جو بھی

ما ابتغی من دخلہا عنہا حولا (نزہۃ الخواطر ص۳) — داخل ہو جاتا ہے پھر اس سے نکلنا نہیں چاہتا۔

علامہ دوانی ہندوستان میں | عمارت جب تیار ہو گئی تو اس دانش پژوہ صاحب علم بادشاہ نے اس کا مصرف یہ کیا کہ علامہ قطب الدین رازی کے تلمیذ رشید مولانا جلال الدین دوانی جب ہندوستان تشریف لائے تو آپ کو اسی عمارت میں ٹھہرایا گیا اور مولانا نے اس عمارت کو اپنا مدرسہ بنا لیا۔

نزہۃ الخواطر میں ان ہی مولانا جلال الدین کے متعلق یہ الفاظ ہیں :

احد العلماء المشہورین بالدرس — درس و افادہ میں جو علماء مشہور ہیں ان میں ایک یہ بھی ہیں

والافادۃ قرء العلوم علی الشیخ قطب الدین — علم آپ کی ذات کا ہے، آپ نے علم الشیخ کے شارح قطب الدین

الرازی شارح الشمسیۃ وقدم الہند (ص۳) — الرازی سے حاصل کیا اور ہندوستان تشریف لائے۔

آگے اسی بالا خانہ والی بنگلہ کی عمارت میں مولانا کے درس و تدریس کا قصہ بیان کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاص فن (معقولات) کے سوا مولانا اس مدرسہ میں حدیث و تفسیر کا بھی درس دیتے تھے، لکھا ہے :-

کان یدرس الفقہ والحدیث والتفسیر — وہ فقہ حدیث تفسیر اور دوسرے نفع بخش علوم کی

وغیرہا من العلوم النافعۃ۔ — وہاں تعلیم دیتے تھے۔

صاحب نزہۃ نے اس کے بعد اس کی بھی تصریح کی ہے کہ :-

وانتفع بہ ناس کثیر واخذ واعنہ (ص۳) "ان سے لوگوں کو بہت نفع پہنچا اور کثرت سے لوگوں نے ان سے علم حاصل کیا"

مولانا نے اس تفصیل میں جگہ جگہ تسامحات ہوئے ہیں۔ مگر ان کی تفصیل سے پیشتر اسلامی فکر کی تاریخ میں علامہ قطب الدین رازی اور محقق دوانی کا مقام متعین کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس کے ساتھ "معقولات" کا مصداق بھی متعین کرنا مستحسن ہے۔

معقولات کا مصداق | معقولات سے عموماً وہ علوم مراد ہوتے ہیں جن میں عقل کو اپنی کاوش دکھانے کا

موقع ملتا ہے۔ اس لئے اس کا مصداق فلسفہ وحکمت ہے، جس میں منطق، طبیعیات، ریاضیات، الٰہیات، علم الاخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدن محسوب ہوتے ہیں۔ (اور عہد حاضر میں سائنس اور فلسفہ کے جملہ شعبے) معقولات کے مقابل منقولات ہے، جس کا مصداق وہ علوم ہیں جو ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں منقول عنہ کی سند پر نقل کئے جاتے ہیں۔ منقولات میں عموماً علوم دینیہ اور علوم ادبیہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ علوم دینیہ ہی میں "علم العقائد" بھی ہے۔ اسے بھی شارع کی سند پر بے چون وچرا تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ مگر جب ان عقائد کو دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو شارع کے معصوم عن الخطاء ہونے کے قائل نہیں ہیں تو پھر انھیں عقلی استدلال کے ساتھ اُن کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ نیز انھیں ان کے باب میں جو شکوک وشبہات یا اعتراضات ہوتے ہیں، اُن کا خالص عقلی بنیادوں پر جواب دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک نیا علم ظہور میں آتا ہے جسے اسلامی فکر میں "کلام" سے موسوم کیا گیا ہے۔ کلام کا مواد (معتقدات) تو خالصۃً دینی ہی ہے مگر اس کا منہاج عقلیاتی ہے اور اسی عقلیاتی منہاج کی بنا پر اسے بھی معقولات میں محسوب کیا جاتا ہے۔

اس طرح معقولات کے دو اہم جزو ہیں: فلسفہ اور کلام اور دونوں کے ارتقا کی مستقل تاریخیں ہیں، جن کا اجمالی خاکہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

علم الکلام کا آغاز وارتقا علم کلام کا آغاز دوسری صدی ہجری کی ابتدا سے ہوتا ہے۔ اس کے خصوصی علمبردار معتزلہ (معتزلہ ثالثہ) تھے[1] اگرچہ کلام کا اطلاق اس سے پہلے دوسرے مفکرین کی بدعتوں پر بھی کیا گیا تھا۔ پہلا عالم معتزلہ کا سید الطائفہ واصل بن عطاء الغزالی تھا۔ واصل شاگرد تھا ابو ہاشم عبداللہ کا اور وہ شاگرد تھے اپنے والد ماجد محمد بن حنفیہ کے۔ محمد بن حنفیہ اس مخصوص انداز فکر کے وارث تھے۔ اپنے پدر بزرگوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے[2] اور وہ تربیت یافتہ تھے، عیار نبوت کے۔

واصل کا شاگرد عثمان بن خالد الطویل تھا اور اُس کا شاگرد ابو الہذیل العلاف۔[3] ابو الہذیل کا شاگرد

---

[1] کتاب الملل والنحل للشہرستانی جلد اول صفحہ ۴۶ "وقیل اخذ واصل عن ابی ہاشم عبداللہ بن محمد بن حنفیہ"

[2] طبقات الفقہاء لابی اسحاق الشیرازی صفحہ ۴۳ "روی عن محمد (محمد بن الحنفیہ) انہ قال: الحسن والحسین خیر منی وانا اعلم بحدیث ابی منہما"

[3] کتاب الملل والنحل للشہرستانی جلد اول صفحہ ۴۹ "ابی الہذیل حمدان بن ابی الہذیل العلاف شیخ المعتزلہ ومقدم الطائفہ ومقرر الطریقہ ... اخذ الاعتزال عن عثمان بن خالد الطویل عن واصل بن عطاء"

ابو یوسف یعقوب الشحام تھا۔[1] اور اس کا شاگرد ابو علی الجبائی۔[2]

ابو علی الجبائی ہی کے شاگرد رشید امام ابو الحسن الاشعری تھے[3] جو پہلے معتزلی تھے مگر بعد میں تائب ہو کر اہل السنت والجماعت میں آملے تھے۔ امام اشعری کے اصحاب میں سے ایک مشہور بزرگ استاذ ابو القاسم الاسکاف الاسفرائنی تھے۔ ان کے شاگرد امام الحرمین تھے[4] اور امام الحرمین کے شاگرد امام غزالی تھے[5] جن کی "تہافت الفلاسفہ" علم الکلام کی ادبیاتِ عالیہ میں محسوب ہوتی ہے۔

امام غزالی کے شاگرد امام معین الدین ابو سعید منصور بن عمر البغدادی تھے۔ اور ان کے شاگرد علامہ مجید الدین محمود بن ابی المبارک بغدادی۔ موخر الذکر کے شاگرد قاضی ناصر الدین بیضاوی کے والد بزرگوار تھے اور ان کے شاگرد ان کے صاحبزادے قاضی ناصر الدین بیضاوی۔[6] قاضی ناصر الدین بیضاوی حسب تصریح ابن خلدون کلامی تفکیر میں ایک مستقل طریق فکر کے بانی تھے۔[7] قاضی بیضاوی کے شاگرد رشید شیخ زین الدین الہنکی تھے۔ اور ان کے شاگرد قاضی عضد الدین الایجی[8] جو "المواقف فی الکلام" کے مصنف ہیں۔ قاضی عضد اور ان کی اس عظیم المرتبت

[1] باب ذکر المعتزلہ ص۴۹ :- "ابو یعقوب یوسف بن عبد اللہ بن اسحاق الشحام من اصحاب ابی الہذیل والیہ انتہت ریاسۃ المعتزلۃ فی البصرۃ فی وقتہ"

[2] باب ذکر المعتزلہ ص۴۹ :- "ابو علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی .... وھو الذی سہل علم الکلام و ذللہ۔ کان شیخہ ابا یعقوب الشحام"

[3] وفیات الاعیان لابن خلکان جلد اول ص۴۸۰ :- "ابو علی محمد بن عبد الوہاب ...... المعروف بالجبائی احد ائمۃ المعتزلۃ ..... وعنہ اخذ الشیخ ابو الحسن الاشعری"

[4] تبیین کذب المفتری لابن عساکر ص۲۴۵ :- "الاستاذ الامام ابو القاسم المتکلم الاسفرائنی الاصم المعروف بالاسکاف ..... من اصحاب الاشعری ..... قرء علیہ امام الحرمین"

[5] تبیین کذب المفتری ص۲۹۱ :- "محمد بن محمد ابو حامد الغزالی حجۃ الاسلام ..... قدم نیسابور مختلفا الی درس امام الحرمین ..... حتی تخرج عن مدۃ قریبۃ"

[6] مرآۃ الجنان للیافعی جلد رابع ص۲۲۰ :- تفقہ بابیہ وتفقہ والدہ بالعلامۃ مجید الدین محمود بن ابی المبارک البغدادی الشافعی وتفقہ مجید الدین بالامام معین الدین ابی سعید منصور بن عمر البغدادی وتفقہ ھو بالامام زین الدین حجۃ الاسلام ابی حامد الغزالی"

[7] مقدمہ ابن خلدون ص۴۶۳ :- "ولقد اختلطت الطریقتان عند ھؤلاء المتاخرین والتبست مسائل الکلام بمسائل الفلسفۃ بحیث لا یتمیز احد الفنین من الآخر ..... کما فعلہ البیضاوی"

[8] الدرر الکامنہ جلد ثانی ص۳۲۲ :- "(قاضی عضد الدین الایجی) اخذ عن مشائخ عصرہ ولازم الشیخ زین الدین الہنکی

تصنیف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خواجہ حافظ شیرازی نے قاضی عضد کو ابو اسحاق انجو والی شیراز کے عہد کے پانچ رتنوں میں محسوب کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف   بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد

قاضی عضد کی جلالت قدر کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ہر چند محمد تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ) کے عہد میں مختلف علوم کے باکمال موجود تھے، مگر اُس نے انھیں ہندوستان لانے کے لئے شہر دہلی کے مشہور فاضل مولانا معین الدین عمرانی کو اُن کے پاس شیراز بھیجا۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں لکھا۔

"چنیں گویند کہ سلطان محمد تغلق کہ قاضی عضد را بدیار ہندوستان طلبید و توشیح متن مواقف بنام خود التماس نمودہ، ہم مولانائے مذکور (مولانا معین الدین عمرانی) را فرستادہ بود۔ آثار فضل و دانش از وے (مولانا عمرانی) درانجا بظہور آمد"[1]

اسی طرح آزاد بلگرامی نے "سبحۃ المرجان" میں لکھا ہے۔

"ارسلہ السلطان محمد بن تغلق شاہ	سلطان محمد تغلق نے مولانا معین الدین
ولی الھند المتوفی سنہ ستین وخمسین	عمرانی کو قاضی عضد الدین ایجی کے پاس شیراز
وسبعمائۃ الی القاضی عضد الدین الایجی	بے شمار تحف و ہدایا کے ساتھ بھیجا اور اُن سے
بشیراز ذا تحف الیہ ھدایا غیر محصورۃ	ہندوستان آنے اور اس سرزمین کو اپنے
والتمس بالھند قدومہ واستسقی لھذا	ابر فیض سے سیراب کرنے کی درخواست کی۔
الارض غیومہ فامسکہ السلطان ابو اسحٰق	مگر سلطان ابو اسحاق نے انھیں روک لیا،
ورجم تقییدہ بسلسلۃ الاحسان علی الابلاغ"[2]	اور احسان کی زنجیروں میں قید کر لیا۔

قاضی عضد کی "المواقف فی الکلام" اکثر سلاطین و ملوک اپنے نام پر معنون کرانا چاہتے تھے، چنانچہ مقدمہ میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"بکرھا من ابکار الجنان لم یطمثھا من قبل انس ولا جان	کتاب المواقف دوشیزۂ جنت ہے
وکنت برھۃ من الزمان اجیل رأیی وأردد قداحی واوامر	ایک دوشیزہ ہے ... میں ایک مدت تک

۱۔ اخبار الاخیار ص ۱۴۲۔ ۲۔ سبحۃ المرجان ص ۱۴۰۔

نفس واشتغل وروی الناس من اسمه فکان مع تھم و [illegible] خاطبیها وکثرة الراغبین فیها فی کثرة ازدهار العیلة [1] [illegible]

اسی جلالت قدر اور عظمت فکر کی بنا پر بعض مؤرخین نے قاضی عضد الدین کو آٹھویں صدی کا "مجدد ملت" قرار دیا ہے[2] ابن حجر عسقلانی نے اُن کے علم و فضل کے بارے میں لکھا ہے :

القاضی عضد الدین الایجی ... کان اماماً فی المعقول قائماً بالاصول والمعانی والعربیة مشارکاً فی الفنون [3]

قاضی عضد الدین الایجی ... معقولات میں امام تھے، اصول، معانی اور عربیت میں دستگاہ رکھتے تھے۔ مختلف فنون میں دستگاہ حاصل تھی۔

فلسفہ و حکمت کی اجمالی تاریخ فلسفہ کا آغاز یونان میں ہوا۔ تاریخوں میں پہلا فلسفی تالیس ملطی کو بتایا جاتا ہے۔ مگر جس شخص نے سب سے پہلے خود کو فلسفی یا "محب الحکمہ" کہا وہ فیثاغورث تھا۔ قدیم مسلمان مؤرخین نے سر ایشیا کی اتباع میں اُسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصحاب کا خوشہ چین بتایا ہے[4] (اگرچہ محققین یورپ کا خیال ہے کہ اس کا فلسفہ اور فی ستریات سے ماخوذ تھا) فیثاغورث کے پیروؤں کا شاگرد افلاطون تھا اور افلاطون کا شاگرد ارسطو۔

ارسطو کے شاگردوں کی ایک جماعت بطالمہ مصر کے زمانہ میں اسکندریہ چلی گئی تھی جہاں اُنھوں نے مشہور مدرسۂ فلسفیہ کی بنیاد ڈالی۔ سن مسیحی کی ابتدا کے قریب اس مدرسہ کا سربراہ اندرونیقوس تھا۔ اُس کے بعد بھی یہ مدرسہ قائم رہا یہاں تک کہ مسلمانوں نے مصر کو فتح کر لیا، اس کے بعد بھی یہ مدرسہ اسکندریہ میں چلتا رہا مگر پہلی صدی ہجری کے سرے پر یہ مدرسہ اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو گیا۔[5] وہاں سے خلیفہ متوکل علی اللہ عباسی (۲۳۲ - ۲۴۷ھ) کے زمانہ میں حران کے اندر اور وہاں سے معتضد باللہ عباسی (۲۷۹-۲۸۹ھ)

[1] شرح المواقف جلد اول ص۳۔ [2] تاریخ گزیدہ ص۸۰۶ اند رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام مروی است کہ خدائے تعالیٰ اسلام بہر ہشتصد سال عالمے عزیز کہ وجود او سبب رواج کار دین واسلام باشد ... و در صدہ ہشتم ... [illegible] عضد الدین بودہ۔ [3] الدرر الکامنہ جلد ثانی۔ ص۳۲۲۔

[4] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص۱۷۔ فیثاغورث الفیلسوف المشهور ... من فلاسفة یونان وحکمائهم ...... اخذ الحکمة عن اصحاب سلیمان بن داؤد النبی بمصر حین دخلوا الیها من بلاد الشام۔

[5] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ۔ جلد ثانی ص۱۳۵

عہدِ خلافت میں بغداد چلا آیا۔[1] اس زمانہ میں اس کا مشہور رکن یوحنا بن حیلان تھا۔[2] یوحنا بن حیلان کا شاگرد ابونصر فارابی تھا۔ فارابی کا شاگرد یحییٰ بن عدی المنطقی کا شاگرد ابوسلیمان سجستانی تھا جس کے خوشہ چین وہ لوگ تھے جن سے ابو عبداللہ ناتلی نے علومِ حکمیہ اخذ کئے تھے۔ ابو عبداللہ ناتلی کا شاگرد شیخ ابوعلی سینا تھا۔ شیخ فارابی کا بھی معنوی شاگرد تھا چنانچہ بیہقی نے "تتمہ صوان الحکمہ" میں لکھا ہے:

"وکان ابوعلی تلمیذ التصانیفه" (تتمہ صوان الحکمہ) اور شیخ ابوعلی سینا فارابی کی تصانیف کا شاگرد تھا۔

شیخ ابوعلی سینا ایک مستقل نظامِ فلسفہ کا بانی ہے جو آج تک اسلامی فلسفہ کے نام سے مدارسِ عربیہ بالخصوص ہندوستان کے مدارس میں پڑھایا جاتا ہے، اسلام کی ثروتِ فکر نے شیخ کے بعد اور بھی عبقری پیدا کئے جیسے ابوالبرکات بغدادی، نجم الدین نخجوانی، شہاب الدین مقتول مشرق میں؛ اور ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد مغرب میں —— مگر قبولِ عام اگر نصیب ہوا تو صرف شیخ ابوعلی سینا ہی کے نظامِ فکر کو —— اور ہمارے یہاں آج بھی فلسفہ کے نصاب میں صرف اُنہی کے متبعین کی تصانیف داخل ہیں۔

شیخ کا شاگردِ رشید بہمن یار تھا اور بہمن یار کا شاگرد ابوالعباس لوکری، جس سے خراسان میں علم و حکمت کی گرم بازاری ہوئی۔[3]

محقق طوسی جن لوگوں نے ابوالعباس لوکری سے کسبِ فیض کیا اُن میں امام افضل الدین غیلانی کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ امام رازی نے "المحصل" میں ارسطو کے مذہب فی الزمان کے خلاف اُن کے ایک وزنی اعتراض کو نقل کیا ہے۔[4] امام افضل الدین غیلانی کے شاگرد سید صدر الدین سرخسی اور اُن کے شاگرد فرید الدین داماد تھے۔ فرید الدین داماد کے شاگردِ رشید محقق طوسی تھے، چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری نے اُن کے تذکرے میں لکھا ہے:

"در معارف عقلیہ تلمیذ فرید الدین داماد است و او شاگرد سید صدر الدین سرخسی و او شاگرد افضل الدین غیلانی و او شاگرد ابی العباس لوکری و او شاگرد بهمنیار و بهمنیار شاگرد شیخ ابی علی سینا"[5]

محقق طوسی کی ذات میں پہلی مرتبہ آکر اسلامی فکر کے چاروں دھارے مجتمع ہو گئے تھے۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

[1] التنبیہ والاشراف للمسعودی ص ۳۲۵۔ [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص ۱۸۳۔ [3] تتمہ صوان الحکمہ للبیہقی ص ۸۵۔ [4] المحصل للرازی ص ۴۳۔ [5] مجالس المؤمنین ص ۳۳۹۔

مبدء و معاد کی معرفت اور سعادت حقیقی کے حصول کے دو راستے ہیں ایک مذہب اور دوسرا فلسفہ۔ دونوں کے طریق کار دو ہیں:۔

استدلال (بحث و نظر) اور کشف و وجدان۔ اس طرح اسلامی فکر کے چار راستے بن گئے:۔

(۱) متکلمین : اتباعِ اسلام کے ملتزم لیکن بحث و نظر کے قائل۔

(۲) صوفیاء : اتباعِ اسلام کے ساتھ ذوق و مکاشفہ کے حامی۔

(۳) مشائیہ : اتباعِ اسلام سے بے نیاز مگر بحث و نظر کے قائل۔

(۴) اشراقیین : اتباعِ اسلام سے بے نیازی کے ساتھ مکاشفہ اور اشراق کے مدعی۔

اسلامی فکر کے یہ چاروں دھارے آخر کار محقق طوسی کے یہاں آکر مل گئے تھے چنانچہ وہ علم کلام اور دیگر علوم شرعیہ میں اپنے پدرِ بزرگوار کے شاگرد تھے۔ وہ شاگرد تھے امام فضل اللہ راوندی کے اور وہ شاگرد تھے میر مرتضیٰ علم الہدیٰ کے[1]

فلسفۂ مشائیت میں اُن کا سلسلۂ تلمذ شیخ بو علی سینا تک پہونچتا ہے، جس کے نظامِ فلسفہ کی تجدید میں محقق کا خاص مقام ہے۔ چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری نے لکھا ہے:۔

"معالم تحقیقات ابو علی را کہ بتصادم شبہات ابو البرکات یہودی و تشکیکات فخر الدین رازی نزدیک باندراس رسیدہ بود، از غایت علو حکمت و کمال ادراک استدراک نمودہ و ذہن این طوات ایشان را ...... ظاہر نمود"[2]

اس کے ساتھ انھیں تصوف کے دقائق و غوامض پر بھی دستگاہ عالی حاصل تھی، چنانچہ اس موضوع پر ان کے اور شیخ صدر الدین قونوی کے درمیان مکاتیب رہا کرتی تھی، مولانا جامی نے لکھا ہے:۔

"الشیخ العارف الفاضل صدر الدین القونوی ...... میان او و سلطان المحققین خواجہ نصیر الدین طوسی ...... اسئلہ و اجوبہ واقع است"[3]

اور تصوف کے اندر شیخ صدر الدین قونوی کا جو مقام ہے وہ ظاہر ہے۔ حسب تصریح مولانا جامی وہ شیخ محی الدین ابن عربی کے فلسفۂ تصوف کے مستند اور معتمد علیہ شارح ہیں اور شیخ ابن عربی کے اقوال کی وہی تعبیرات صوفیائے کرام

[1] مجالس المؤمنین صفحہ ۳۳۹۔ [2] ایضاً۔ [3] نفحات الانس جامی۔ ص۲۳

ہیں مقبول ہیں جو شیخ صدر الدین قونوی سے مروی ہیں۔[1] ان مکاتیب کے علاوہ محقق طوسی نے امیر ناصر الدین محتشم کے ایما سے "عین القضاۃ ہمدانی" کی کتاب "زبدۃ الحقائق" کا ترجمہ کرکے اس کے مشکل مقامات کی شرح کی تھی۔[2]

رہا فلسفۂ اشراق تو محقق طوسی اس کے بھی محرم راز تھے، بلکہ اکثر مسائل میں انھوں نے اشراقی مسلک ہی اختیار کیا ہے۔ مثلاً ماہیت مکان کے باب میں جمہور مشائیہ کے برخلاف انھوں نے اسے "بعد مفطور" بتایا ہے جو اشراقیوں کا مذہب ہے۔ قاضی نوراللہ شوستری نے میر حسن میبذی سے نقل کیا ہے:

"خواجہ نصیر الدین محمد طوسی قدس سرہ ...... در متن تجرید کہ مذہب خاص اوست طریق اشراقیاں مسلوک داشتہ"[3]

بلکہ قاضی نوراللہ شوستری نے تو ان کے بعض رسائل کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

"حضرت خواجہ از متابعان ارباب تصوف و اشراق و نفس قدسی او از لذات دنیوی فارغ و صاحب اطلاق بود"[4]

اس طرح محقق طوسی کی ذات میں اسلامی فکر کے چاروں دھارے آکر مل جاتے ہیں اور غالباً قوم نے انہیں بجا طور پر "محقق" کا خطاب دیا تھا۔ وہ نہ صرف ساتویں صدی ہجری کے جینئس اعظم تھے، بلکہ ابن سینائی فلسفہ کے مجدد بھی تھے۔

محقق طوسی کے شاگرد علامہ قطب الدین شیرازی تھے جیسا کہ ابن حجر عسقلانی نے ان کے ذکر میں لکھا ہے:

"سافر الی النصیر الطوسی فقرء علیہ الہیئۃ وبحث علیہ الاشارات وبرع"[5] وہ سفر کر کے محقق طوسی کے پاس پہونچے پس ان سے ہیئت پڑھی "اشارات" کی بحث کی اور کمال حاصل کیا۔

متاخرین میں امام الدین ریاضی نے "باغستان" کے اندر لکھا ہے:

"شمس فلک المحققین، نیز کوکب المدققین العلامۃ قطب الدین محمد بن مسعود ...... علامہ عجم است و در حکمت شاگرد خواجہ نصیر الدین طوسی است"[6]

---

[1] نفحات الانس جامی ص ۴۶۳۔ "مقصود شیخ در مسئلہ وحدت وجود بدیہیکہ مطابق عقل و شرع باشد جز بہ تتبع تحقیقات وے و فہم آن کما ینبغی میسر نمی شود" [2] مجالس المومنین ص ۳۳۰ - [3] ایضاً ص ۳۳۰ - [4] ایضاً ص ۳۳۰
[5] الدرر الکامنہ جلد رابع ص ۳۳۹ - [6] تذکرہ باغستان ورق ۲۷۳ ب -

قطب الدین رازی | علامہ قطب الدین شیرازی کے شاگرد مولانا قطب الدین رازی تھے، چنانچہ امام الدین ریاضی نے اُن کے تذکرے میں لکھا ہے:۔

"علم از علمائے کبار اخذ نمودہ، از آں جملہ است مولانا قطب الدین علامہ شیرازی" (تاشقان ورق ۱۹۷)

اس طرح قریباً قرن کے فلسفہ و حکمت کا سرمایہ محقق طوسی اور علامہ قطب الدین شیرازی کے توسط سے مولانا قطب الدین رازی کے یہاں پہونچا۔ فلسفہ و حکمت کے علاوہ وہ کلام میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ قاضی عضد الدین الایجی مصنف "المواقف فی الکلام" کے شاگرد تھے۔ چنانچہ ابن عماد حنبلی نے اُن کے تذکرے میں لکھا ہے:۔

"قطب الدین محمد وقیل محمود	مولانا قطب الدین محمد بن محمد الرازی (اور
ابن محمد الرازی ...... شارك	بعض لوگ اُن کا نام محمود بتاتے ہیں) ....
فی العلوم الشرعیة واخذ عن	علوم شرعیہ میں بھی حظ وافر رکھتے تھے۔ انھوں نے
العضد وغیرہ[1]	قاضی عضد وغیرہ سے پڑھا تھا"

اس علمی سرمایہ میں جو انھوں نے قاضی عضد سے حاصل کیا تھا "المواقف فی الکلام" بھی تھا جسے انھوں نے قاضی عضد سے پڑھا تھا۔ مولانا قطب الدین رازی سے "المواقف" کو اُن کے صاحبزادے مولانا مخلص الدین نے پڑھا اور ان سے سبقاً سبقاً میر سید شریف نے پڑھا۔ اسی لئے میر سید شریف کی شرح المواقف کے سامنے دوسرے فضلاء نے جو "المواقف" کی شرحیں لکھی تھیں ماند ہو کر گوشۂ گمنامی میں جا پڑیں۔

اس طرح قاضی عضد اور مولانا قطب الدین رازی کے توسط سے صدیوں کا کلامی ورثہ میر سید شریف تک پہونچا۔

(باقی)

[1] شذرات الذہب۔

ڈاک کی شکایت

جنوری ۱۹۶۱ء کا بُرہان نہ پہونچنے کی شکایات بہت زیادہ آئی ہیں اور خصوصیت سے دہلی کے متعدد خریداروں نے بھی کی ہے۔ دلی یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ کے اساتذہ جن کو کبھی شکایت نہیں ہوئی ان کو بھی اس ماہ کا رسالہ نہیں ملا۔ ہم کارکنانِ ڈاک خانہ کو اس طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

(نیاز مند: منیجر)